علامہ اقبال اور دارالمصنّفین

ڈاکٹر الیاس الاعظمی

علامہ شبلی نعمانی (۴؍جون ۱۸۵۷ء - ۱۸؍نومبر ۱۹۱۴ء) کا ایک اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے ایسے افراد کی علمی تربیت اور ذہن سازی کی جو ان کے مشن کو جاری رکھ سکیں، اسلام پر ہونے والے ناروا اعتراضات کا رد کر سکیں، یورپ بالخصوص مستشرقین کے مسکت جوابات دے سکیں۔ چنانچہ وہ اسی مقصد کے حصول کے لیے تحریک ندوہ سے وابستہ ہوئے، اسی مقصد سے انھوں نے ماہنامہ الندوہ جاری کیا اور اسی مقصد کے تحت دارالمصنّفین قائم کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ علم وفن، شعر وادب اور تعلیم وسیاست کے میدان میں ہم خیال علماء وفضلاء اور دانشوروں کی ایک مؤثر جماعت تشکیل دینے میں کامیاب رہے۔ ان کے تلامذہ میں مولانا حمیدالدین فراہیؒ، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا عبدالباری ندوی، مولوی اقبال احمد خاں سہیل، مولوی مسعودعلی ندوی، مولوی شبلی متکلم، مولانا ضیاء الحسن ندوی اور مولانا عبدالرحمٰن نگرامی وغیرہ وہ نمایاں نام ہیں جنھوں نے فکر شبلی کو زندگی بھر سینے سے لگائے رکھا۔

ان کے علاوہ شبلی کے مستفیدین نے جن میں، مولانا محمد علی جوہر، ظفر علی خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، حسرت موہانی، خواجہ غلام الثقلین اور بابائے اردو مولوی عبدالحق، کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ مذہب وسیاست، درس وتدریس، شعر وادب اور تحقیق وتدقیق کے میدان کے ایسے نام ہیں جنھیں ہماری تاریخ کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر ایک ایسا کاروانِ علم وادب بھی وجود میں آیا جس نے شبلی سے اگرچہ براہ راست استفادہ نہیں کیا تھا تاہم ان کے افکار وخیالات سے ہم آہنگ، مؤید اور متبع تھا۔ اس طبقہ میں سب سے نمایاں نام حکیم الامت علامہ محمد اقبال (۹؍نومبر ۱۸۷۷ء-۲۱؍اپریل ۱۹۳۸ء) کا ہے۔ ڈاکٹر محمد ریاض نے اقبال کے پیش رو بزرگوں کے ذکر میں لکھا ہے کہ:

انیسویں صدی کے پیش رؤں جیسے سرسید احمد خاں (م:۱۸۹۸ء)، چراغ علی (م:۱۸۹۵ء) اور اپنے جملہ بزرگ معاصرین مثلاً خواجہ الطاف حسین حالی (م:۱۹۱۴ء)، اکبر الہ آبادی (م:۱۹۲۱ء)، غلام قادر گرامی

(م:۱۹۲۰ء) اور سید امیر علی (م:۱۹۲۸ء) وغیرہم سے اقبال نے گونا گوں تاثر لیا ہے مگر بحیثیت مجموعی شمس العلماء محمد شبلی نعمانی (م:۱۹۱۴ء) کی تصانیف کے بارے میں ان کا تاثر زیادہ گہرا اور متنوع نظر آتا ہے۔[۱]

سید افتخار حسین شاہ نے لکھا ہے:

میں شبلیات اور اقبالیات کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اقبال اپنی زندگی اور نظریات کے اعتبار سے مجموعی صورت میں اردو و فارسی کے اپنے پیش رو شاعروں اور نثر نگاروں میں سب سے زیادہ جس کے قریب نظر آتے ہیں وہ مولانا شبلی ہیں۔[۲]

علامہ شبلیؒ

علامہ اقبال (۹/نومبر ۱۸۷۷ء) عمر میں شبلی (۴/جون ۱۸۵۷ء) سے بیس سال چھوٹے تھے۔ ان کے دور طالب علمی میں شبلی کے علم و فضل اور ان کی عظیم الشان تصنیفات و تحقیقات: مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، المامون، سیرۃالنعمان، الجزیہ، کتب خانۂ اسکندریہ اور الفاروق کا ہر طرف ڈنکا بج رہا تھا۔ سرسید احمد خاں، ڈپٹی نذیر احمد، منشی ذکاء اللہ دہلوی، مولانا الطاف حسین حالی اور عبدالحلیم شرر وغیرہ نے شبلی کے ذوق علم و تحقیق، وسعت مطالعہ اور اسلوب نگارش کا برملا اعتراف کر کے عظمت شبلی سے پورے ملک کو روشناس کرا دیا تھا۔ شبلی کے روم و مصر و شام کے سفر اور سفرنامے کی اشاعت سے انگریزی حکومت شبلی کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا ہوگئی تھی اور وہ شبلی کو ترکوں کا ایجنٹ اور اور جمال الدین افغانی کا ہم نوا خیال کر رہی تھی اور ترکی حکومت سے ملے تمغۂ مجیدیہ کے استعمال پر پابندی لگا دی تھی۔[۳] شبلی کے جذبہ اتحاد اسلامی کے سبب مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ جو حریت پسند اور قوم پرور خیالات کا حامل تھا ان کا والہ و شیدا ہو گیا تھا۔ غالباً یہی زمانہ ہے جس میں اقبال علامہ شبلی سے متاثر ہوئے اور ان کے قریب آئے۔ انھوں نے پہلی کوشش یہ کی کہ علامہ شبلی کو مستقل طور پر پنجاب بلا لیں۔ تاکہ ان کے علم و فضل سے اہل پنجاب مستفید ہو سکیں مگر مسلمان امراء کی کم ذوقی کے سبب ان کی یہ کوشش بار آور نہ ہو سکی۔[۴]

۱۹۰۴ء میں علامہ اقبال نے اپنی پہلی کتاب علم الاقتصاد لکھی۔ علامہ اقبال کی خواہش پر شبلی نے علم الاقتصاد کا مطالعہ کیا اور اس کے بعض حصوں کی زبان و بیان کی تصحیح کی۔[۵] اس سے یہ واضح ہے کہ علامہ اقبال ۱۹۰۳ء سے پہلے ہی علامہ شبلی کے علم و فضل اور ادب و انشا کے معترف تھے۔

۱۹۰۱ء میں علامہ شبلی حکومت حیدرآباد کے سر رشتہ علوم و فنون سے وابستہ ہوئے۔ یہاں انھوں نے سلسلہ کلامیہ کا آغاز کیا اور الغزالی، علم الکلام، الکلام اور سوانح مولانا روم جیسی اہم کتابیں ان کے قلم سے نکلیں جو ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۶ء کے درمیان شائع ہوئیں۔ ۱۹۰۷ء میں علامہ اقبال نے ڈاکٹریٹ کا مقالہ *The Development of Metaphysics in Parsia* لکھا۔ یہ مقالہ ۱۹۰۸ء میں لوزک اینڈ کمپنی

لندن نے شائع کیا۔ اس میں شبلی کی دو کتابوں الغزالی اور علم الکلام کا علامہ اقبال نے حوالہ دیا ہے[۶] یعنی ان کی نظر میں شبلی کی یہ کاوشیں اس لائق تھیں کہ انہیں مآخذ و مراجع کے طور پر استعمال کیا جائے۔

علامہ اقبال، مولانا روم، مثنوی معنوی اور ان کے فکر و فلسفے کے بڑے مداح تھے۔ یقین ہے کہ اقبال نے سوانح مولانا روم کا جو اردو میں مولانا روم کی پہلی سوانح عمری ہے ضرور مطالعہ کیا ہوگا۔ اس لیے کہ علامہ شبلی کی یہ کتاب اس عام خیال سے کہ مولانا روم کی شخصیت محض تصوف و سلوک سے عبارت تھی ہٹ کر لکھی گئی ہے اور دکھایا گیا ہے کہ مولانا روم علم کلام کے بڑے ماہر تھے اور ان کی مثنوی معنوی علم کلام کی بھی کتاب ہے۔[۷] سوانح مولانا روم سے اقبال کی دلچسپی ان کے ذوق و مزاج کی آئینہ دار ہے تاہم ان کی اس ذوق آفرینی میں شبلی کی کتاب نے بقول اینا میری شمل غیر معمولی کردار ادا کیا۔[۸] شبلی نے جبر و قدر، تجدد امثال اور دیگر کلامی مباحث پر روشنی ڈالی ہے چونکہ اقبال کو ان موضوعات سے گہرا شغف تھا اس لیے قیاس ہے کہ اقبال نے ان کی تحریروں سے ضرور استفادہ کیا ہوگا۔

۱۹۰۳ء میں علامہ شبلی انجمن ترقی اردو کے پہلے سکریٹری نامزد ہوئے، انھوں نے انجمن کو ترقی دینے کی بھرپور کوشش کی۔ انھی کی تحریک پر اخبارات کے ایڈیٹر انجمن کے رکن بنے، اردو کی بہترین کتاب پر انعام دینے کا سلسلہ انھی نے شروع کیا۔ ان کا اس سلسلے کا سب سے اہم کام اردو کتابوں کے ترجمے کا ہے۔ انھوں نے ۱۴ر کتابوں کو ترجمے کے لیے منتخب کیا جس میں دو کتابیں فلسفہ تعلیم اور رہنمایان ہند شائع ہوسکیں۔ فلسفہ تعلیم کا ترجمہ خواجہ غلام الحسنین پانی پتی نے کیا ہے۔ علامہ شبلی نے اسے جن چار اہل علم کے پاس ان کی رائے کے لیے بھیجا تھا ان میں ایک علامہ اقبال بھی تھے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کے یورپ جانے سے پہلے شبلی ان کی خوابیدہ صلاحیتوں سے واقف اور فلسفہ تعلیم کے ساتھ انگریزی و اردو پر ان کی مشاقانہ نظر کے قائل ہو چکے تھے۔ چنانچہ انھی چاروں اہل علم جن میں علامہ اقبال کے علاوہ ڈپٹی نذیر احمد بھی شامل تھے، کے اتفاق آراء سے یہ ترجمہ اشاعت کے لیے منظور ہوا۔[۹]

۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۲ء کے درمیان شبلی کی شعر العجم کی چار جلدیں شائع ہوئیں۔ پانچویں جلد شبلی کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ اقبال نے یقینی طور پر ان کا مطالعہ کیا تھا اور وہ ان کے مداح تھے۔ ظہور الدین مہجور نے کشمیر کے شعرائے فارسی کا تذکرہ لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا اور ایک خط میں علامہ اقبال سے اس کا ذکر کیا تو اقبال نے مشورہ دیا کہ یہ تذکرہ ضرور لکھیے مگر حروف تہجی کے اعتبار سے نہ لکھیے بلکہ شعر العجم کی طرح شعراء فارسی کی شاعری کا ناقدانہ جائزہ ہونا چاہیے۔[۱۰] یہ اقبال کی زبان سے عظمت شبلی کے اعتراف کا ایک نمونہ ہے۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء یعنی بیسویں صدی کے دوسرے دہے کے آغاز میں جب شبلی کے علم و کمال کا شہرہ نصف النہار پر تھا اور عظمت اقبال کے اعتراف کا سلسلہ قائم ہو چکا تھا۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس دہلی میں دونوں کی پہلی اور غالباً آخری ملاقات ہوئی۔ اس اجلاس کی صدارت مولانا شاہ سلیمان پھلواروی نے کی تھی۔

علامہ اقبال اس میں نہ صرف شریک ہوئے بلکہ ایک اجلاس کی صدارت بھی کی، ایک مختصر تقریر اور اپنی نظم 'بلاد اسلامیہ' کا وہ حصہ جو مدینہ منورہ سے متعلق ہے پڑھ کر سنایا۔ اسی اجلاس میں علامہ اقبال کو کانفرنس کی طرف سے ''ترجمانِ حقیقت'' کا خطاب دیا گیا۔[۱۱] اس موقع پر سجاد حیدر یلدرم جو علی گڑھ میں علامہ شبلی کے شاگرد رہ چکے تھے، ان کی خواہش پر علامہ شبلی نے علامہ اقبال کو پھولوں کا ہار پہنایا[۱۲] اور ایک مختصر تقریر کی۔ یہی وہ پہلا موقع ہے جب شبلی نے اقبال کو دوسرے غالب ہونے کی بشارت دی تھی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ:

یہ رسم کوئی معمولی رسم نہیں ہے اور اس کو محض تفریح تصور نہ کرنا چاہیے، ہم مسلمانوں کا یہ شعار رہا ہے کہ ہم جس قدر قوم کی دی ہوئی عزت اور خطابات کی قدر کرتے رہے ہیں اتنی کسی اور عزت کی شہرت ہمارے ناموں کی نہیں ہوئی۔ محقق طوسی وغیرہ کو اس زمانے کے سلاطین نے بڑے بڑے خطابات دیے لیکن آج سو کتابوں کے اوراق کسی زبان پر نہ چڑھ سکے لیکن قوم کی طرف سے محقق کا جو خطاب دیا گیا تھا وہ آج تک زبان زد خاص و عام ہے۔ جو عزت قوم کی طرف سے آج ڈاکٹر اقبال کو دی جاتی ہے وہ ان کے لیے بڑی عزت و توقیر کی بات ہے اور حقیقت میں وہ اس عزت کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر اقبال کا علم، ادب اور ان کی شاعری کا مقابلہ غالب کی شاعری سے کیا جائے تو مبالغہ نہیں ہوسکتا۔[۱۳]

یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اپنے عہد کے اردو کے سب سے بڑے ادیب اور نقاد نے علامہ اقبال کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف ایک مجمع خواص میں کیا۔ اس سے جہاں اقبال کے اندر اعتماد پیدا ہوا ہوگا وہیں یقیناً اقبال کی شیفتگی شبلی میں بھی اضافہ ہوا ہوگا۔ اس سے ایک اور بات واضح ہوکر سامنے آتی ہے کہ علامہ شبلی نے جس طرح مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کی موقع بہ موقع حوصلہ افزائی اور تربیت کی اسی طرح انھوں نے علامہ اقبال کا بھی حوصلہ بڑھایا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ:

مولانا شبلی مرحوم نے اقبال کو اسی وقت پہچانا تھا جب ہنوز ان کی شاعری کے مرغ شہرت نے پر و بال نہیں پیدا کیے تھے۔ چنانچہ انھوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ حالی و آزاد کی جو کرسیاں خالی ہوں گی ان میں سے ایک اقبال کی نشست سے پر ہو جائے گی۔[۱۴]

۱۹۱۲ء میں جب علامہ شبلی نے وقف علی الاولاد کے لیے قانون بنانے کی تحریک چلائی، مختلف شہروں کا دورہ کیا اور ملک کے ممتاز اہل علم و دانش اور قانون دانوں سے رابطہ قائم کیا تو ڈاکٹر اقبال سے بھی خط کتابت کی۔ وائسرائے سے ملاقات کے لیے جو وفد تجویز ہوا تھا شبلی نے اس میں اقبال کو بھی شامل کیا تھا۔ اس سلسلے میں علامہ شبلی نے اقبال کو جو خط لکھا وہ محفوظ نہیں رہا۔ البتہ اس کے جواب میں علامہ اقبال نے جو خط لکھا تھا وہ محفوظ ہے۔[۱۵]

اس خط کے علاوہ علامہ اقبال کی کسی اور تحریر بلکہ علامہ شبلی کی وفات (۱۸/نومبر ۱۹۱۴ء) تک دونوں کے درمیان ربط و تعلق کی کوئی تفصیل دستیاب نہیں۔

یہی وہ زمانہ ہے جب علامہ شبلی سیرۃ النبیؐ کی تالیف و تدوین میں ہمہ وقت مصروف تھے۔ یہ کتاب ان کی وفات کے بعد ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی۔ تصنیفات شبلی میں سیرۃ النبیؐ شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ اردو کی وہ مایہ ناز کتاب ہے جس کا جواب اردو تو کیا عربی و فارسی میں بھی مفقود ہے۔ شبلی کے اس معجزہ علمی کا سارا زمانہ معترف ہے۔ علامہ اقبال بھی شبلی کے اس اعجاز کمال کے بڑے معترف و مداح تھے۔ انھوں نے ایک خط میں لکھا ہے کہ ''مولانا مرحوم نے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے جس کا صلہ دربار نبویؐ سے عطا ہوگا۔''[۱۶]

الکلام میں علامہ شبلی نے جبر و قدر کے موضوع پر جو بحث کی ہے اس کا پرتو جاوید نامہ میں بالکل صاف دکھائی دیتا ہے۔ علامہ اقبال نے الکلام (جدید علم کلام) کا کس قدر گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ اس کا اندازہ مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ان کے ایک خط سے ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

الکلام کے صفحہ ۱۱۳-۱۱۴ پر مولانا شبلیؒ نے حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۲۳ کا ایک فقرہ عربی میں نقل کیا ہے جس کے مفہوم کا خلاصہ انھوں نے اپنے الفاظ میں دیا ہے۔ اس عربی فقرہ کے آخری حصہ کا ترجمہ یہ ہے:

اس بنا پر اس سے بہتر اور آسان طریقہ کوئی نہیں کہ شعار، تعزیرات اور انتظامات میں خاص اس قوم کے عادات کا لحاظ کیا جائے جس میں یہ امام پیدا ہوئے۔ اس کے ساتھ آنے والی نسلوں پر ان احکام کے متعلق چنداں سخت گیری نہ کی جائے۔

مہربانی کر کے یہ فرمائیے کہ مندرجہ بالا فقرہ میں لفظ شعار سے کیا مراد ہے اور اس کے تحت کون کون سے مراسم یا دستور آتے ہیں۔ اس لفظ کی مفصل تشریح مطلوب ہے، جواب کا سخت انتظار رہے گا۔[۱۷]

مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کے جواب میں کیا لکھا اس کا علم نہیں لیکن اقبال کے دوسرے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب نے شعار کا جو مفہوم بیان کیا تھا، علامہ اقبال کو اس سے تشفی نہیں ہوئی۔[۱۸]

اردو میں مذہبی، تاریخی، سیاسی اور واقعاتی نظم گوئی کے آغاز کا افتخار شبلی کے سر ہے جس کی علامہ اقبال نے بڑی تحسین کی ہے اور زور دیا ہے کہ یہ سلسلہ قائم رہنا چاہئے۔[۱۹] دانستہ نہ سہی شبلی کی اس روایت کو خود اقبال نے بڑی ترقی دی، شبلی کے ایک اور یگانہ روزگار شاگرد اقبال احمد خاں سہیل نے شبلی کی مذہبی اور تاریخی نظموں کے سلسلے کو شعوری طور پر ارتقا کی منزلوں سے ہم کنار کیا۔ اور بقول آل احمد سرور ''شبلی نے اپنی سیاسی نظموں میں جس شگفتگی اور حسن کاری سے کام لیا، وہ مولانا سہیل کے یہاں اور نکھری ہوئی ہے۔''[۲۰] شبلی کی اس روایت کو مولانا سید سلیمان ندوی نے بھی ترقی دینے کی کوشش کی، وہ خود لکھتے ہیں:

۱۹۱۲ء میں جب مولانا شبلی نے نئی اردو شاعری کی طرح ڈالی تو دل نے اس میں بھی استاذ کی پیروی کا حق ادا کرنا چاہا۔ متعدد نظمیں اس رنگ میں لکھیں جن کا خاتمہ استاذ کے ماتم پر ہوا جو نوحہ استاذ کے نام سے ۱۹۱۵ء میں پونا میں چھپا۔ جہاں میں ان دنوں دکن کالج میں فارسی لکچرر تھا۔ میں نے جب یہ نوحہ لکھا تو اکبر الہ آبادی، ڈاکٹر اقبال، عزیز لکھنوی، مولانا شروانی وغیرہ اور استاذ مرحوم کے اکثر دوستوں اور قدردانوں کے

پاس اس تحفہ کو بھیجا۔ سب نے تعریفیں کیں اور دل بڑھایا۔[۲۱]

ڈاکٹر محمد ریاض لکھتے ہیں:

اسلامی تاریخی واقعات کو نظم کرنے اور ہنگامی و وقتی واقعات کے بارے میں قطعات لکھنے کے نقطۂ نظر سے اقبال کے پیش رو شبلی ہی نظر آتے ہیں۔ اقبال کی ایسی نظموں اور قطعوں کے نمونے باقیات اقبال اور بانگ درا میں خصوصاً دیکھے جا سکتے ہیں۔[۲۲]

۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی نے ۵۷ر سال کی عمر میں وفات پائی تو ہر طرف صف ماتم بچھ گئی، رسائل و اخبارات میں ان کے سانحہ وفات کو ملت کا ایک بڑا حادثہ اور پر نہ ہونے والا خلا بتایا گیا۔ متعدد اہل قلم نے شبلی کے علم و فضل اور ان کے عظیم الشان کارناموں پر مضامین لکھے۔ ان کے احباب اور ملک کے نامور شعراء نے بڑے دلدوز مضامین اور مرثیے لکھے۔ اسی زمانے میں مولانا حالی نے بھی داغ مفارقت دی۔ علامہ اقبال ان سانحوں پر تڑپ اٹھے اور انھیں ایک نظم میں خراج عقیدت پیش کیا جو ان کے مجموعۂ کلام بانگ درا میں 'شبلی و حالی' کے نام سے شامل ہے۔

علامہ اقبال نے ایک مصرع میں شبلی کی تاریخ بھی کہی ہے جو اگرچہ اقبال کے متروک کلام کا حصہ ہے تاہم اس سے اقبال کی نظر میں شبلی کی عظمت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

امام الہند والا نژاد شبلی طاب ثراہ

۱۳۳۲ھ[۲۳]

دارالمصنّفین

دارالمصنّفین علامہ شبلی کی آخری یادگار ہے۔ اسے انھوں نے ۱۹۱۴ء میں قائم کیا۔ ابھی وہ پورے طور پر اس ادارے کو مستحکم بھی نہ کر سکے تھے کہ وفات پا گئے۔ ان کے بعد ان کے تلامذہ نے دارالمصنّفین کو قائم رکھنے اور ترقی دینے کی غرض سے مجلس اخوان الصفا قائم کی جس کے صدر مولانا حمید الدین فراہی، سکریٹری مولانا سید سلیمان ندوی اور ممبر کی حیثیت سے مولانا عبدالسلام ندوی، مولوی مسعود علی ندوی اور مولوی شبلی متکلم آگے بڑھے اور استاذ مرحوم کے فکر و خیال کے مطابق دارالمصنّفین کو اس قدر ترقی دی کہ وہ عالم اسلام کا مایہ ناز علمی و تحقیقی ادارہ تسلیم کیا گیا۔ اس کے قیام کا بنیادی مقصد مصنّفین اور اہل قلم کی تربیت، بلند پایہ کتابوں کی تصنیف و تالیف و ترجمہ اور ان کے طبع و اشاعت کا سامان کرنا تھا۔[۲۴] بلاشبہ دارالمصنّفین کے اہل قلم اور مصنّفین نے مختلف اسلامی علوم و فنون پر دو سو سے زائد بلند پایہ علمی و تحقیقی کتابیں لکھیں۔ تصنیف و تالیف کے لیے کئی اہل علم کی تربیت کی اور متعدد اہل قلم اس کے گوشہ عافیت میں پل کر جوان ہوئے اور ملک کے مختلف حصوں میں علم و ادب کے چراغ روشن کیے جس کی کوئی دوسری مثال نہیں مل سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ

۱۹۱۴ء سے اب (۲۰۱۰ء) تک کے نہ صرف پاک و ہند، بنگلہ دیش بلکہ عالم اسلام کے ممتاز علماء وفضلاء اور دانشوروں نے دارالمصنّفین اور اس کے علماء و مصنّفین کی زبردست پذیرائی کی، اس کی کتابوں کو سراہا، اسے سند و اعتبار کا درجہ دیا اور اس کے رسالہ معارف کو علمی دنیا کا گل سرسبد قرار دیا۔ حکیم الامت علامہ محمد اقبال نے بھی دارالمصنّفین سے پوری دلچسپی لی۔ اس کی مطبوعات ان کے مطالعے میں رہیں خاص طور سے مجلس دارالمصنّفین کے ماہوار رسالہ معارف سے انھیں بڑی دلچسپی تھی اور وہ اس کے مشتاق رہتے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ان کے متعدد خطوط میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی

شبلی ہی کی طرح اقبال کی عظمت شناسی میں مولانا سید سلیمان ندوی (م:۱۹۵۴ء) کا بھی کردار بہت اہم ہے۔ اقبال ان کے معاصر اور ان کے استاذ کے ممدوح تھے۔ خط کتابت کا سلسلہ ۱۹۱۴ء میں قائم ہوا۔ دونوں ایک دوسرے کے علم وفضل کے بھی بڑے معترف و مداح تھے۔ ماہنامہ معارف کے متعدد شذرات میں سید صاحب نے اقبال کا ذکر ان کی زندگی ہی میں کیا۔ رموز بے خودی کا تعارف و تجزیہ سب سے پہلے انھی کے قلم سے نکلا۔ نادرشاہ کی دعوت پر تعلیمی اصلاحات کے لیے دونوں افغانستان گئے، سر راس مسعود بھی اس وفد کے رکن تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے سفرنامہ سیر افغانستان میں اس کی تفصیل موجود ہے۔[۲۵]

مولانا سید سلیمان ندوی سے اقبال کی دلچسپی جانشین شبلی کی حیثیت سے ہوئی۔ انھوں نے لکھا کہ ''مولانا شبلیؒ کے بعد آپ استاذ الکل ہیں، اقبال آپ کی تنقید سے مستفید ہوگا۔''[۲۶] پھر ان کے علم وفضل کے وہ بڑے قائل ہوتے چلے گئے۔ سید صاحب کے نام علامہ اقبال کے ۷۰/خطوط اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ میں شامل ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سید صاحب کے فضل و کمال سے بے حد متاثر تھے۔ علامہ نے متعدد علمی امور میں ان سے استفسار اور استفادہ کیا اور ان کے علم وفضل اور شکوہ سلیمانی کی زبردست تحسین و ستائش کی۔ ایک جگہ لکھا کہ:

> آج سید سلیمان ندوی ہماری علمی زندگی کے سب سے اونچے زینے پر ہیں۔ وہ عالم ہی نہیں امیر العلماء ہیں، مصنف ہی نہیں رئیس المصنّفین ہیں ان کا وجود علم وفضل کا ایک دریا ہے جس سے سیکڑوں نہریں نکلی ہیں اور ہزاروں سوکھی کھیتیاں سیراب ہوئی ہیں۔[۲۷]

ایک دوسرے خط میں لکھا کہ: ''علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندوی کے اور کون ہے''۔[۲۸]

علامہ اقبال نے نہ صرف سید سلیمان ندوی کی عظمت کا اعتراف کیا بلکہ ان کی کتابوں کی بھی بڑی

تحسین وستائش کی۔ سیرت عائشہؓ کے بارے میں لکھا کہ:

سیرت عائشہؓ کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ یہ ہدیۂ سلیمانی نہیں بلکہ سرمۂ سلیمانی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے سے میرے علم میں بہت مفید اضافہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔[۲۹]

اسی طرح عمر خیام کے بارے میں لکھا کہ:

عمر خیام پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس پر اب کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا، الحمدللہ کہ اس بحث کا خاتمہ آپ کی تصنیف پر ہوا۔[۳۰]

اگر علامہ اقبال نے سید صاحب کے اعتراف کمال میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تو سید صاحب نے بھی اقبال کی شاعرانہ عظمت وبصیرت اور ان کے افکار ونظریات کی زبردست تحسین وستائش کی۔ اقبال کے نام مولانا سید سلیمان ندوی کے خطوط محفوظ نہیں رہے ورنہ اس کی پوری تفصیل سامنے آجاتی۔ تاہم اقبال کے خطوط سے پتا چلتا ہے کہ سید صاحب نے بھی ان کی تعریف وتحسین اپنے خطوط میں کی تھی۔ علاوہ ازیں معارف کے شذرات تحسین اقبال سے پر ہیں۔ سید صاحب نے شذرات کے علاوہ اقبال سے متعلق اولاً انگریزی مضامین کے ترجمے شائع کیے۔ رموز بے خودی پر تبصرہ کیا،[۳۱] جسے اقبال نے بے حد پسند کیا۔[۳۲] اسی طرح ان کی نظم 'خضر راہ' پر بھی اظہار خیال کیا۔[۳۳] زبان وبیان کی طرف ابتداءً سید سلیمان ندوی ہی نے انھیں متوجہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں اقبال نے متعدد استفسارات کیے اور سید صاحب نے ان کے جوابات دیے۔ ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء کو علامہ اقبال نے وفات پائی تو ماتم اقبال میں معارف کے صفحات غمگین اور سوگوار ہوگئے۔ ان جلیل القدر شخصیات میں جس قدر جذباتی تعلق تھا، ماتم اقبال بھی اسی قدر جذباتی ہے۔ سید صاحب لکھتے ہیں:

وہ (اقبال) ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا۔ آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہوگئی۔ ایسا عارف فلسفی، عاشق رسول شاعر، فلسفۂ اسلام کا ترجمان اور کاروانِ ملت کا حدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو۔ اس کے دہن کا ہر ترانہ بانگ درا، اس کی جان حزیں کی ہر آواز، زبور عجم، اس کے دل کی ہر فریاد، پیام مشرق، اس کے شعر کا ہر پر پرواز بال جبریل تھا۔ اس کی فانی عمر گو ختم ہوگئی۔ لیکن اس کی زندگی کا ہر کارنامہ جاوید نامہ بن کر انشاء اللہ باقی رہے گا۔[۳۴]

اقبال کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

اقبال صرف شاعر نہ تھا وہ حکیم تھا، وہ حکیم نہیں جو ارسطو کی گاڑی کے قلی ہوں یا یورپ کے نئے فلاسفروں کے خوشہ چیں بلکہ وہ حکیم جو اسرار قدرت کا محرم اور رموز فطرت کا آشنا تھا۔ وہ نئے فلسفہ کے ہر راز سے آشنا ہوکر اسلام کے راز کو اپنے رنگ میں کھول کر دکھاتا تھا یعنی بادۂ انگور کو نچوڑ کر کوثر وتسنیم کا پیالہ تیار کرتا تھا۔[۳۵]

اس نثری مرثیے کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوتا ہے:-

اقبال ہندوستان کا فخر اقبال، اسلامی دنیا کا ہیرو اقبال، فضل وکمال کا پیکر اقبال، حکمت ومعرفت کا دانا اقبال،

کاروانِ ملت کا رہنما اقبال! رخصت، رخصت۔ الوداع۔ الوداع۔ سلام اللہ علیک ورحمۃ الی یوم التلاق۔[۳۶]

اسی مضمون میں مولانا سید سلیمان ندوی نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ:

اقبال کی تصنیفات زمانہ میں یادرہیں گی۔ وہ اسلام کا غیر فانی لٹریچر بن کر ان شا اللہ رہے گا۔ ان کی شرحیں لکھی جائیں گی۔ نظریے ان سے بنیں گے۔ ان کا فلسفہ تیار ہوگا۔ اس کی دلیلیں ڈھونڈھی جائیں گی۔ قرآن پاک کی آیتوں، احادیث شریفہ کے جملوں، مولانا رومی اور حکیم سنائی کے تاثرات سے ان کا مقابلہ ہوگا اور اس طرح اقبال کا پیام اب دنیا میں ان شاءاللہ ہمیشہ زندہ رہے گا اور اقبال زندہ جاوید۔[۳۷]

سید صاحب کے یہ خیالات کس قدر سچ ثابت ہوئے اقبالیات کے وسیع ذخیرے سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی

مولانا عبدالسلام ندوی بھی علامہ شبلی کے عزیز شاگرد اور دارالمصنّفین کے معماروں میں سے تھے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی دارالمصنّفین کی خدمت میں صرف کی۔ اسوۂ صحابہ، اسوۂ صحابیات، شعرالہند، حکمائے اسلام، ابن خلدون، طبقات الامم، ابن یمین، تاریخ الحرمین الشریفین، فقرائے اسلام، فطرت نسوانی وغیرہ کتابیں ان کی اہم کاوشیں ہیں۔ وہ آخری سانس تک دارالمصنّفین سے وابستہ رہے اور اسی کی خاک کا پیوند ہوئے۔

مولانا عبدالسلام ندوی شبلی کے ان شاگردوں میں سے تھے جن پر علامہ شبلی کو ناز تھا۔ وہ نہ صرف دارالمصنّفین کے بلکہ ہندوستان کے بڑے ماہر اقبالیات تھے۔ آزاد ہندوستان میں اقبال پر پہلی کتاب اقبالِ کامل انھی کے قلم سے نکلی۔ اس میں انھوں نے علامہ اقبال کے حالات وسوانح، اخلاق وعادات اور ان کی تصنیفات اور مجموعۂ کلام پر نقد وتبصرہ کیا ہے اور علامہ اقبال کے ان کارناموں کا بھی ذکر ہے جسے وہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ اس کے بعد ان کی شاعرانہ عظمت اور بلندی کی سرگذشت ہے جس کے مختلف ادوار قائم کرکے ہر دور کے کلامِ اقبال کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اردو کے ساتھ ان کے فارسی کلام پر بھی تنقیدی نگاہ ڈالی ہے اور کلام اقبال کے محاسن و نقائص دونوں دکھائے۔ علامہ اقبال کی شہرت ومقبولیت اور اس کے اسباب اور ان کے کلام کے تراجم کا بھی تفصیل سے ذکر ہے۔ فلسفہ خودی اور اس کے اجزاء وعناصر بھی بیان کیے گئے ہیں۔ ملت، تعلیم، سیاست، صنف لطیف، فنون لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ سے متعلق نظریات اقبال کا تنقیدی تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ آخر میں نعتیہ کلام پر نقد وتبصرہ ہے۔[۳۸] اس طرح اقبال کامل علامہ اقبال کی ہمہ گیر شخصیت اور فکر وفن پر ایک جامع اور مبسوط تصنیف قرار پاتی ہے۔ اقبال پر جو چند اہم کتابیں مرجع تسلیم کی جاتی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں:

اقبال پر درجنوں کتابیں اور ہزاروں مضامین لکھے گئے ہیں اور بے شمار تقریریں اس پر ہو چکی ہیں لیکن یہ

سلسلہ نہ ختم ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ اقبال پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں محققانہ تصانیف بہت کم ہیں۔ میرے نزدیک اقبال پر دو کتابیں نہایت عالمانہ، نہایت بلیغ اور نہایت جامع ہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی روحِ اقبال اور مولانا عبدالسلام ندوی کی اقبالِ کامل۔ ان دونوں کتابوں کو ملا کر پڑھیں تو اقبال کے کلام اور ان کی تعلیم کا کوئی پہلو ایسا نہیں دکھائی دیتا جو محتاج تشریح اور تشنۂ تنقید باقی رہ گیا ہو۔[۳۹]

اس کے علاوہ مولانا عبدالسلام ندوی نے اقبال کے فلسفۂ خودی پر ایک مفصل مقالہ لکھا ہے جو ماہنامہ معارف میں آٹھ طویل قسطوں میں شائع ہوا۔ اسے ہم دانائے راز کے فلسفہ خودی کا پہلا بھرپور مطالعہ قرار دے سکتے ہیں۔ اس کا کچھ حصہ اقبال کامل میں شامل ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی کے حصے میں علامہ اقبال کی دو خواہشوں کی تکمیل کی سعادت بھی آئی۔ علامہ اقبال نے ایک خط میں مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھا کہ:

> اس وقت سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ اسلامی کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے اس مبحث پر مصر میں ایک چھوٹی سی کتاب شائع ہوئی تھی جو میری نظر سے گذری ہے مگر افسوس ہے کہ بہت مختصر ہے اور جن مسائل پر بحث کی ضرورت ہے مصنف نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اگر مولانا شبلی زندہ ہوتے تو میں ان سے ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا۔ موجودہ صورت میں سوائے آپ کے اس کام کو کون کرے گا۔[۴۰]

اسی طرح ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

> دارالمصنّفین کی طرف سے ہندوستان کے حکمائے اسلام پر ایک کتاب نکلنی چاہیے اس کی سخت ضرورت ہے۔ عام طور پر یورپ میں سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی کوئی فلسفیانہ روایات نہیں۔[۴۱]

سید صاحب نے یہ کتابیں تو نہیں لکھیں البتہ مولانا عبدالسلام ندوی کے قلم سے ان دونوں موضوعات پر کتابیں نکلیں۔ تاریخ فقہ اسلامی پر کتاب لکھنے کا اقبال کا مشورہ ۱۸/مارچ ۱۹۲۶ء کا ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے محمد الخضری کی کتاب التشریع الاسلامی کا ترجمہ ۱۹۲۷ء میں تاریخ فقہ اسلامی کے نام سے دارالمصنّفین سے شائع کیا۔ اسی طرح حکمائے اسلام کے لکھنے کا مشورہ علامہ اقبال نے سید صاحب کو ۴/ستمبر ۱۹۳۳ء کو دیا تھا۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے حکمائے اسلام کے نام سے دو جلدوں میں کتاب لکھی۔ پہلی جلد ۱۹۵۳ء میں اور دوسری ۱۹۵۶ء میں دارالمصنّفین سے شائع ہوئی۔

مولانا عبدالسلام ندوی نے ان دونوں کتابوں کے مقدموں میں یہ صراحت تو نہیں کی ہے کہ یہ کتابیں علامہ اقبال کی خواہش پر لکھی گئیں مگر چونکہ دارالمصنّفین کے علمی منصوبے مولانا سید سلیمان ندوی بنایا کرتے تھے اس لیے قیاس ہے کہ ان دونوں کتابوں کے منصوبے علامہ اقبال کی خواہش پر بنائے گئے۔

انقلابِ روس کے بعد وہاں کے مسلمانوں کے حالات سے بہت کم آگاہی تھی۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے اس خیال کے پیش نظر روسی مسلمانوں کے حالات پر ماہنامہ معارف میں ایک سلسلہ مضامین

شروع کیا جو چھ قسطوں میں پورا ہوا۔ اس مضمون کی ابتدائی تین قسطیں ''مسلمانانِ روس'' کے عنوان سے شائع ہوئیں۔[۴۲] جبکہ آخری تین قسطیں ''اسلام اور نصرانیت کی کشمکش روس میں'' کے عنوان سے اپریل-جولائی-اگست ۱۹۱۸ء کے شماروں میں چھپیں۔ علامہ اقبال کو یہ مضامین پسند آئے تو انھوں نے سید صاحب سے اسے رسالہ کی صورت میں علیٰحدہ شائع کرنے کی خواہش کی۔[۴۳] مگر ان کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔

شاہ معین الدین احمد ندوی

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ندوہ کے نامور فرزند اور مولانا سید سلیمان ندوی کے دست گرفتہ تھے۔ ۱۹۲۴ء میں دارالمصنّفین سے وابستہ ہوئے اور سید صاحب کے بعد دارالمصنّفین کی نظامت کا بار انھی کے کاندھوں پر آیا چنانچہ وہ دارالمصنّفین کے کاموں کو آخری سانس تک انجام دیتے رہے۔ متعدد کتابیں ان کے قلم سے نکلیں جس میں سیرالصحابہ، تاریخ اسلام، حیات سلیمان، خریطہ جواہر، تابعین اور دین رحمت وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان کا ادبی مذاق بڑا پختہ اور اسلوب نگارش بڑا شستہ و شگفتہ تھا۔ ان کے ادبی مضامین کا مجموعہ ادبی نقوش کے نام سے شائع ہوا ہے۔ انھوں نے علامہ اقبال پر دو اہم مضامین لکھے اور کئی مضامین میں اقبال کا ضمناً ذکر کیا ہے۔

بعض ناعاقبت اندیشوں نے اقبال پر فرقہ پرستی کا الزام عائد کیا تو شاہ صاحب نے ایک تنقیدی مقالہ ''کیا اقبال فرقہ پرست شاعر تھے؟'' کے عنوان سے ماہنامہ معارف جنوری-فروری ۱۹۵۰ء میں لکھا اور اس بے حقیقت الزام کی پورے طور پر تردید کی۔ یہ مقالہ ان کی اقبال سے شیفتگی اور اقبالیات پر گہری نظر کا غماز ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> اقبال کی شاعری کا موضوع بہت پامال ہو چکا ہے اور اس پر اتنا لکھا جا چکا ہے کہ اس کا کوئی پہلو مشکل سے تشنہ باقی ہوگا اور اب اس پر لکھنے کی بہت کم گنجائش ہے لیکن جن لوگوں کی نظر ان کے پورے کلام اور اس کی غرض و غایت پر نہیں ہے، ان کی جانب سے ان پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ فرقہ پرست شاعر تھے۔ ان کا دل اپنی قوم اور اپنے وطن کی محبت سے خالی تھا، انھوں نے قومیت اور وطنیت کی مخالفت کی ہے، ان کی تعلیمات اور ان کے پیام میں عالم گیریت نہیں ہے۔ انھوں نے عالم انسانیت یا کم از کم ہندوستانی قوم کو مخاطب بنانے کے بجائے صرف مسلمانوں سے خطاب کیا ہے اور اپنی شاعری میں صرف اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی ہے، وہ اسلامی حکومت کے قیام کے داعی اور صرف مسلمانوں کا غلبہ و اقتدار چاہتے تھے۔ ان کی فرقہ پرستی کے ثبوت میں اور بھی اسی قبیل کے اعتراضات کیے جاتے ہیں۔
>
> لیکن یہ تمام اعتراضات اقبال کے افکار و تصورات، ان کے نصب العین، ان کے مقصد شاعری، یورپ کی سیاست، مذہب اسلام، مشرقی قوموں خصوصاً مسلمانوں کے زوال کی تاریخ سے ناواقفیت اور کلام اقبال پر

قصورِ نظر کا نتیجہ ہیں اگر ان امور کی روشنی میں اقبال کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو یہ سارے اعتراضات خود بخود رفع ہو جائیں۔[۴۴]

پھر خود شاہ صاحب نے انھی امور کی روشنی میں کلامِ اقبال اور نظریۂ اقبال کا مفصل جائزہ لیا ہے اور معترضین کے خیالات کو بے بنیاد ثابت کیا ہے۔

شاہ صاحب کی اقبال شناسی کا اصل نمونہ ان کا مقالہ ''اقبال کی تعلیمات پر ایک نظر'' ہے جو ماہنامہ معارف اکتوبر تا دسمبر ۱۹۷۱ء و جنوری ۱۹۷۲ء کے شماروں میں شائع ہوا ہے۔ دراصل یہ ایک مکمل کتاب ہے جو اب تک کتابی صورت میں شائع نہ ہوسکی۔ اس میں شاہ صاحب نے اقبال کی تعلیمات کا مفصل مطالعہ و جائزہ پیش کیا ہے۔ اس کا سبب تحریر بیان کرتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں:-

اقبال مفکر اور فلسفی بھی تھے اور راسخ العقیدہ مسلمان بھی۔ ارکان اسلام کے بارے میں ان کے عقائد بالکل ایک ٹھیٹھ مسلمان کے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے کلام میں جا بجا حکمائے اسلام پر طنز و تعریض کی ہے لیکن ان کے مخاطب عوام و خواص دونوں تھے۔ ان کا مقصد مذہب کے متعلق مغربی افکار و تصورات کے طلسم کو توڑنا اور مسلمانوں کی مغرب زدہ نئی نسل میں خصوصیت کے ساتھ اسلامی روح پیدا کرنا تھا۔ اس لیے انھوں نے دونوں کی زبان میں گفتگو کی ہے، ٹھیٹھ اسلام بھی پیش کیا ہے اور اس کی تعلیمات کی حکیمانہ تعبیریں بھی کی ہیں۔ ان کی حکیمانہ تعلیمات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن ٹھیٹھ اسلامی تعلیمات پر کم لکھا گیا ہے۔ اس لیے اس مقالہ میں ان کی دوسری تعلیمات کے ساتھ اسلام کے بنیادی ارکان توحید، رسالت، وحی قرآن اور اسلامی شریعت وغیرہ کے متعلق ان کے خیالات خصوصیت کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔[۴۵]

اس کے بعد شاہ صاحب نے اقبال کی ٹھیٹھ اسلامی تعلیمات و نظریات کی کلام اقبال کی روشنی میں تشریح و توضیح کی ہے۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

شاہ صاحب کے بعد دارالمصنّفین کی باگ ڈور سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کے ہاتھوں میں آئی۔ وہ بھی عظمت اقبال کے بڑے قائل اور ان کے ایک بڑے شیدائی تھے۔ علامہ کے صد سالہ یوم وفات پر اسلام آباد میں منعقدہ کانگریس میں دارالمصنّفین کی نمائندگی کی اور معارف میں اس کی مفصل روداد قلم بند کی۔ ایک بہت اہم مقالہ ''کیا علامہ اقبال یورپ کے فلسفہ سے متاثر تھے'' لکھا۔[۴۶] جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبالیات پر ان کی بھی بڑی گہری نظر تھی۔ طاہر تونسوی کی کتاب اقبال اور سید سلیمان ندوی پر انھوں نے جو دیباچہ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے استاذ مولانا سید سلیمان ندوی کی طرح انہیں بھی اقبال سے بڑی عقیدت تھی۔ ۱۹۸۱ء کے اقبال انسٹی ٹیوٹ سری نگر کشمیر کے سیمی نار میں انھوں نے شرکت کی اور اس کی مفصل روداد معارف میں لکھی۔[۴۷] مگر اس کے علاوہ کوئی اور کام اقبال پر نہ کر سکے۔

ماہنامہ معارف

علامہ شبلی دارالمصنّفین سے ایک رسالہ جاری کرنا چاہتے تھے۔ اس کا نام معارف انھی کا تجویز کیا ہوا ہے۔ اس کا خاکہ بھی وہ بنا گئے تھے۔ ان کی وفات کے بعد جولائی ۱۹۱۶ء میں مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے استاذ کی خواہش کی تکمیل میں یہ رسالہ جاری کیا تو اقبال نے اس سے بھی پوری دلچسپی لی۔ اس کا مطالعہ وہ بڑی دلچسپی سے کیا کرتے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ان کے خطوط سے اس کی تفصیلات کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے ایک خط میں معارف کے متعلق لکھا ہے کہ: ''یہی تو ایک رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارت ایمانی میں ترقی ہوتی ہے۔''[۴۸] اسی طرح ایک اور خط میں لکھا ہے کہ معارف مجھے خاص طور پر محبوب ہے۔[۴۹]

معارف اور اس کے فاضل مدیروں نے اقبال اور اقبالیات کو ہمیشہ اہمیت دی۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ مطالعہ اقبال کا آغاز صحیح معنوں میں ماہنامہ معارف ہی سے ہوا۔ معارف کی اقبال شناسی کے کئی پہلو ہیں۔ [۱] کلام کی اشاعت [۲] مکتوبات اقبال کی اشاعت [۳] تجاویز اور مشورے [۴] تصانیف اقبال اور فکر اقبال پر مضامین و مقالات کی اشاعت وغیرہ۔

[۱] علامہ اقبال نے مدیر معارف مولانا سید سلیمان ندوی کی خواہش پر کئی تازہ تخلیقات معارف میں اشاعت کے لیے بھیجیں۔ ان کی پہلی غزل جو ترانۂ اقبال کے عنوان سے جون ۱۹۱۸ء میں معارف میں شائع ہوئی بانگ درا میں 'میں اور تو' کے عنوان سے شامل ہے۔

اقبال کا دوسرا کلام جو ماہنامہ معارف (اکتوبر ۱۹۱۹ء) میں شائع ہوا، وہ ان کی ایک چھوٹی سی نظم ''پولٹیکل گداگری'' ہے۔ نظم کا یہ نام علامہ اقبال کی خواہش پر مولانا سید سلیمان ندوی کا دیا ہوا ہے جسے اقبال نے اولاً پسند کیا مگر بانگ درا میں جب شامل کیا تو عنوان بدل کر ''دریوزۂ خلافت'' کر دیا۔ اور پہلا شعر بھی بدل دیا۔

اس کے بعد اگست ۱۹۲۳ء میں اقبال کی مشہور فارسی غزل جس کا آغاز اس مصرع سے ہوا ہے:

درہم و دینار من دولت بیدار من

''نغمہ ساربان حجاز'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اسی طرح فروری ۱۹۲۴ء کے معارف میں ''خلافت اور ترک و عرب'' کے عنوان سے گرامی کی غزل پر اقبال کی تضمین شائع ہوئی ہے۔ چار اشعار پر مشتمل اس تضمین کا پہلا شعر یہ ہے:

سخنے راندہ کہ جز قرشی
بر سر مسند نبی نہ نشست

[۲] علامہ اقبال نے مدیر معارف مولانا سید سلیمان ندوی کے نام متعدد خطوط لکھے جن کی تعداد ستر ہے۔ معارف نے اقبال کے جو خطوط شائع کئے ہیں ان کی تعداد ۶۲ ہے۔ یہ خطوط معارف میں اپریل

۱۹۵۴ء سے مارچ ۱۹۵۵ء کے درمیان شائع ہوئے ہیں، اس کے بعد دارالمصنّفین نے مشاہیر کے خطوط میں انھیں شامل کر کے شائع کیا۔ چونکہ اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ میں مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ستر خطوط شامل تھے۔ اس لیے طاہر تونسوی نے اپنی کتاب اقبال اور سید سلیمان ندوی میں انھیں شامل کیا۔ وہ آٹھ خطوط دارالمصنّفین نے اپنے مجموعہ میں کیوں شامل نہیں کیے اب تک واضح نہیں ہو سکا۔

معارف میں اقبال کا ایک اہم خط جو نکلسن کے نام انگریزی میں لکھا گیا تھا اس کا اردو ترجمہ اکتوبر ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا ہے۔ مترجم کا ذکر نہیں البتہ یہ اہم خط ڈکنسن کے اعتراضات کے جواب میں ہے۔ رموز بے خودی کے مطالعہ و جائزہ میں اس خط کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ اقبال نے اس میں متعدد وضاحتیں کی ہیں۔

[۳] معارف کے شذرات میں معارف کے مدیروں نے وقتاً فوقتاً علمی، ادبی اور تاریخی موضوعات پر مفید آراء و تجاویز پیش کی ہیں۔ اقبال کے سلسلے میں محض ایک تجویز کا ذکر جنوری ۱۹۲۲ء کے شذرات میں ملتا ہے۔ اس زمانے میں مسلم یونیورسٹی نے شہزادہ ولی عہد برطانیہ، گورنر صوبہ متحدہ، ممبر تعلیمات حکومت ہند، مہاراجا گوالیار اور نواب صاحب رام پور کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس پر سخت تنقید کی اور مشورہ دیا کہ اصلاً اس اعزاز کے مستحق سید امیر علی، عماد الملک سید حسین بلگرامی، ڈاکٹر اقبال، جسٹس عبدالرحیم اور عبدالحلیم شرر وغیرہ ہیں۔

دسمبر ۱۹۲۴ء میں مسلم یونیورسٹی نے سید امیر علی اور ڈاکٹر محمد اقبال کو اعزازی ڈگری دینے کا اعلان کیا تو اس پر جنوری ۱۹۲۵ء کے معارف میں مسرت کا اظہار کیا گیا کہ ابتداءً معارف ہی نے یہ تجویز پیش کی تھی۔ واضح رہے کہ جنوری ۱۹۲۵ء کے معارف کے شذرات مولانا عبدالسلام ندوی کے قلم سے ہیں۔

۱۹۲۳ء میں ڈاکٹر اقبال کو ''سر'' کا خطاب ملا۔ معارف میں اس کا بھی ذکر ہے۔

[۴] افکار اقبال کے مطالعہ کا آغاز معارف کی ابتدائی جلدوں میں ہی ہو گیا تھا۔ اپریل ۱۹۱۸ء میں مولانا سید سلیمان ندوی نے رموز بے خودی پر تبصرہ کیا پھر نکلسن اور ڈکنسن کے مضامین کا اردو ترجمہ شائع کیا۔ 'خضر راہ' اور بعض دوسری نظموں پر مولانا سید سلیمان ندوی نے نوٹ لکھے اور یہ کوشش کی کہ اقبال کے افکار پر بحث و تحقیق کا آغاز ہو۔ چنانچہ ان کی ان کوششوں کے مثبت نتائج سامنے آئے۔ خود اقبال نے وضاحتی و تشریحی خطوط مدیر معارف کو لکھے۔ یوں معارف کے ذریعے فکر و فلسفہ اقبال کے مطالعے کا ایک دور شروع ہوا۔

ماہنامہ معارف نے عہد سلیمانی سے لے کر اب تک اقبال کی سوانح، شاعرانہ عظمت اور ان کے فکر و فلسفہ پر سیکڑوں مضامین و مقالات شائع کیے ہیں۔[۵۰]

❁❁❁

حواشی وحوالہ جات

۱- طاہر تونسوی، اقبال اور مشاہیر۔ اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، سوئیوالاں، دہلی، ص ۱۲۶۔
۲- سید افتخار حسین شاہ، اقبال اور پیروی شبلی، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۷۸ء، ص ۱۰-۱۱۔
۳- مولوی عبدالرزاق کان پوری، شبلی معاصرین کی نظر میں، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۲۰۰۵ء، ص ۶۷۔
۴- مشاہیر کے خطوط بنام مولانا سید سلیمان ندوی، مطبوعہ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ص ۹۶۔
۵- علامہ اقبال، علم الاقتصاد، خادم التعلیم سٹیم پریس، لاہور، ص ۷۔
۶- بحوالہ اقبال اور مشاہیر، ص ۱۲۷۔
۷- علامہ شبلی، سوانح مولانا روم، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء، ص ۸۱۔
۸- اقبال اور مشاہیر، ص ۲۷۔
۹- خواجہ غلام الحسنین پانی پتی، مقدمہ فلسفۂ تعلیم، انسٹی ٹیوٹ پریس، علی گڑھ، ۱۳۳۹ھ، طبع دوم، ص ۳-۴۔
۱۰- بحوالہ اقبال اور پیروی شبلی، ص ۳۳۔
۱۱- ضیاء الدین برنی، عظمت رفتہ، ادارہ علم وفن، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۲۷۰۔
۱۲- نسیم عباس چوہدری، اقبالیات اور قرۃالعین حیدر، اقبال اکادمی، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۳۷۔
۱۳- سید افتخار حسین شاہ، اقبال اور پیروی شبلی، ص ۴۲۔
۱۴- مولانا سید سلیمان ندوی، یاد رفتگاں، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۱۹۹۳ء، ص ۱۸۳۔
۱۵- کلیات مکاتیب اقبال، حصہ اوّل، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۱ء، ص ۲۳۹۔
۱۶- مشاہیر کے خطوط، ص ۹۹۔
۱۷- ایضاً، ص ۱۳۲-۱۳۳۔
۱۸- ایضاً، ص ۱۳۳۔
۱۹- ایضاً، ص ۹۶۔
۲۰- محمد حسن، انٹر کالج میگزین، سہیل نمبر، جون پور، مرتبہ: نیاز احمد صدیقی، ص ۴۲۔
۲۱- ماہنامہ، معارف، اعظم گڑھ، جولائی ۱۹۵۰ء، ص ۱۰۔
۲۲- اقبال اور مشاہیر، ص ۱۳۰۔
۲۳- کلیات باقیات شعرِ اقبال، مرتبہ: صابر کلوروی، اقبال اکادمی، لاہور، ص ۵۱۵۔
۲۴- محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین کی تاریخی خدمات، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۲ء۔
۲۵- مولانا سید سلیمان ندوی، سیر افغانستان، نفیس اکیڈمی کراچی۔ ۱۹۴۵ء، ص ۱۰، ۲۹، ۳۰، ۸۱، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۷۸، ۱۸۰، ۲۰۲-۲۰۳ وغیرہ۔

۲۶- مشاہیر کے خطوط، ص ۹۸۔
۲۷- طاہر تونسوی، اقبال اور سید سلیمان ندوی، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۱۹۔
۲۸- مشاہیر کے خطوط، ص ۱۳۴۔
۲۹- ایضاً، ص ۱۱۲۔
۳۰- ایضاً، ص ۱۳۹۔
۳۱- ماہنامہ، معارف، اپریل، ۱۹۱۸ء۔
۳۲- مشاہیر کے خطوط، ص ۹۸۔
۳۳- ماہنامہ، معارف، مئی ۱۹۲۲ء۔
۳۴- سید سلیمان ندوی، یاد رفتگاں، ص ۱۸۱۔
۳۵- ایضاً، ص ۱۸۲-۱۸۳۔
۳۶- ایضاً، ص ۱۸۳۔
۳۷- ایضاً، ص ۱۸۲۔
۳۸- مولانا عبدالسلام ندوی، اقبال کامل، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء۔
۳۹- خلیفہ عبدالحکیم، فکر اقبال، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۷ء، ص ۱۴۔
۴۰- مشاہیر کے خطوط، ص ۱۲۴۔
۴۱- ایضاً، ص ۱۳۴۔
۴۲- ماہنامہ، معارف، جولائی تا ستمبر ۱۹۱۸ء۔
۴۳- مشاہیر کے خطوط، ص ۱۰۶۔
۴۴- ماہنامہ، معارف، جنوری ۱۹۵۰ء، ص ۴۳۔
۴۵- ماہنامہ، معارف، اکتوبر ۱۹۷۱ء۔ ص ۲۴۵۔
۴۶- ماہنامہ، معارف، فروری ۱۹۸۴ء
۴۷- ماہنامہ معارف، نومبر ۱۹۸۱ء
۴۸- اقبال نامہ، حصہ اوّل، مرتبہ: شیخ عطاء اللہ، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ص ۸۰۔
۴۹- مشاہیر کے خطوط، ص ۱۱۸۔
۵۰- مضمون نگار نے اقبالیات معارف کی فہرست منسلک کی ہے جس کے مطابق معارف میں اقبال پر ۱۵۸ مضامین، ۹۴ تبصرۂ کتب اور ۱۲ منظومات شائع ہوئیں۔ یہ فہرست قدرے جامعیت کے ساتھ ہمارے مجلّے کی جنوری ۲۰۰۷ کی اشاعت میں شائع ہو چکی ہے، اس لیے مکرر یہ فہرست نہیں دی جا رہی ہے۔ (مدیر)